© rasailojaraid.com

دنیا دار العمل ہے یا دار المکافات؟

سوال:- کتاب "تجدید و احیائے دین" کے صفحہ ۲۶ پیراگراف ۲ پر تحریر فرمایا گیا ہے:-

"یہ دنیوی زندگی چونکہ آزمائش کی مہلت ہے اس لیے یہاں نہ حساب ہے نہ جزا و سزا یہاں جو کچھ ہوتا ہے وہ کسی عملِ نیک کا انعام نہیں ہے بلکہ امتحان کا سامان ہے، اور جو تکالیف، مصائب و شدائد وغیرہ پیش آتے ہیں وہ کسی عمل کی سزا نہیں، بلکہ زیادہ تر اس قانونِ طبعی کے تحت جس پر اس دنیا کا نظام قائم کیا گیا ہے، آپ سے آپ ظاہر ہونے والے نتائج ہیں"

اس مندرجہ بالا تحریر سے کسی طرح دل کو تسکین نہیں ہوتی۔ پورے غور و فکر کے ساتھ مع سیاق و سباق کئی بار پڑھا اور سمجھنے کی کوشش کی گئی، لیکن مدعا سمجھ میں نہیں آیا۔ مختلف انبیاء علیہم السلام کی امتوں کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ان کی امتوں نے جب نبی کی دعوت سے سرکشی کی تو ان پر دنیا میں ہی ذلت، ہلاکت، تباہی اور غلامی مسلط کر دی گئی اور ان پر طرح طرح کے عذاب آئے۔ اس کے برخلاف جس قوم نے اپنے نبی کی دعوت پر لبیک کہا تو ان کو دنیا کی امامت اور پیشوائی سے سرفراز کیا گیا، اور امتِ وسط اور شہداء علی الناس کا خطاب دیا گیا۔ سرکش اور نافرمان اقوام میں بنی اسرائیل، قومِ فرعون، قومِ ثمود، اور قومِ لوط و شعیبؑ وغیرہ پر جو تباہیاں اور عتاب دنیا میں نازل ہوئے تو یہ ان کی نافرمانی اور سرکشی کا انجام تھا۔ آخرت میں تو ان کے لیے دکھ دینے والا بڑا عذاب ہے ہی: اس سے یہ تشریح ہوتا ہے کہ دنیا میں بھی عملِ بد اور عملِ نیک کی انسان کو کچھ نہ کچھ سزا مل ہی جاتی ہے۔

اس ضمن میں ایک حدیث بھی آپ دیکھ لیجیے۔ حدیث ۱۷۹۹ بخاری جلد سوم میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ "کسی شخص نے کسی امرِ ممنوعہ کا ارتکاب کیا اور دنیا ہی میں اس کی گرفت ہو گئی تو اس کا کفارہ اور پاکی ہو جائے گی اور اگر خدا اس کی پردہ پوشی کر دے گا تو چاہے اسے بخش دیگا اور چاہے تو عذاب دیگا۔"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی سلسلے میں قرآن مجید سورۂ سجدہ رکوع ۲ کی آیت ولنذیقنھم من العذاب الادنیٰ دون العذاب الاکبر کی تفسیر بھی ملاحظہ ہو۔

اس کے علاوہ ترجمان القرآن جلد ۴۲ عدد ۳۔ ماہِ جون ۱۹۵۴ء کے صفحہ ۲۶ پر تحریر ہے کہ:-

"کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی شخص جو کسی قوم میں رہ کر معصیتوں کا ارتکاب کرے اور اس قوم کے لوگ اس کو بدلنے کی قوت رکھنے کے باوجود اس کو نہ بدلیں اور پھر اللہ تعالیٰ مرنے سے پہلے ان لوگوں کو اس کی سزا نہ دے دے" (مشکوٰۃ: بحوالہ ابوداؤد)

اس اُلجھن کا حل کیا ہے؟

جواب ۔ یہ سوال جس حقیقت سے متعلق ہے وہ ایک پیچیدہ حقیقت ہے۔ اس کے کئی پہلو ہیں، اور اگر ایک سوال کے جواب میں ایک پہلو واضح کر دیا جائے تو دوسرے پہلوؤں کے متعلق نئے سوالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ہم اجمالاً وہ سارے پہلو بیان کر دیتے ہیں جن کو سامنے رکھنے سے آپ اپنے سوال کا جواب بھی پا سکتے ہیں اور اس سے متعلق دوسرے سوالات کے بارے میں بھی از خود حقیقت تک پہنچ سکتے ہیں۔

(۱) "تجدید و احیائے دین" کا کوئی نسخہ راقم الحروف کے پاس اس موقع پر نہیں ہے کہ عبارت کو اس میں دیکھا جا سکے۔ تاہم اس کا منشا واضح ہے۔ یہ عبارت اس دنیا کی حیاتِ انسانی کی عمومی نوعیت کو بیان کرتی ہے کہ یہاں کا نظام فی الجملہ اخلاقی قوانین پر نہیں چل رہا بلکہ قانونِ طبعی کے تابع ہے۔ اس زندگی میں اخلاقی لحاظ سے حساب کتاب اور جزا و سزا کا عمل واقع نہیں ہوتا بلکہ بہ حیثیت مجموعی یہ نظام امتحان و آزمائش کا نظام ہے۔ اسی حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے خود واضح فرمایا ہے کہ:-

الذی خلق الموت والحیٰوۃ لیبلوکم ایکم احسن عملا — وہ کہ جس نے موت اور زندگی کو بنایا تاکہ تمہاری جانچ کر کے دیکھے کہ کون تم میں سے بہتر عمل کرتا ہے۔

آزمائش اور امتحان کی حالت اسی صورت میں برقرار رہتی ہے جبکہ انسان کے لیے ایمان اور کفر یا نیکی اور بدی کے دونوں راستے کھلے ہوں اور وہ جدھر چاہے اپنی آزادی سے گام زن ہو سکے۔ اب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اگر یہاں کا نظام اخلاقی قانون پر چل رہا ہوتا اور ایک قاتل قتل کرتے ہی طبعی طور پر خود اپنی جان سے ہاتھ دھوتا، چور کا ہاتھ چوری کرتے ہی کٹ جاتا، زانی پر زنا کرتے ہی آسمان سے پتھر برسنے لگتے، دین سے روگردانی کرتے ہی آدمی پر عذابِ الٰہی کے آتشیں شعلے حملہ آور ہو جاتے تو امورِ دینی و اخلاقی میں ویسی ہی جبریت پیدا ہو جاتی جیسی امورِ طبعی میں کارفرما ہے۔ ایسی صورت میں ہر فردِ انسانی چار و ناچار مومن صالح ہوتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے حیاتِ ارضی میں "لا اکراہ فی الدین" کی حالت قائم فرمائی ہے۔ اس میں صرف عقلی حیثیت سے رشد و غی کا امتیاز پیدا کرنے کے لیے انبیاء کی بعثت ہوتی رہی ہے اور کتبِ آسمانی کا نزول جاری رہا ہے۔ دین و اخلاق میں طبعی جبریت نہیں رکھی گئی۔

یہاں ایسا نہیں ہے کہ جو شخص مومنِ صالح ہو اس کی صحت اچھی رہے، اس کی کھیتی زیادہ پھل دے، اس کی تجارت کا نفع خود بخود بڑھ جائے، اسے کوئی حادثہ پیش نہ آئے، وہ موت سے بالاتر رہے، اور اسی طرح جو کوئی ایمان اور نیکی سے ہٹ کر زندگی بسر کرے، تمام کی تمام بیماریاں اسی پر حملہ آور ہوں، وہ فاقوں مرا کرے، اس کی کھیتی بنجر رہے، اس کی تجارت میں خسارہ ہوا کرے اور حادثات تاک کر اسی پر حملہ آور ہوں۔ بلکہ یہاں کا طبعی نظام اپنے مجموعی عمل کے لحاظ سے ہر ایک سے یکساں سلوک کرتا ہے۔ سنکھیا یا سنکھیے کی تاثیر فاسق کے لیے بھی وہی ہے جو مومن و مسلم کے لیے ہے، گرمی اور سردی کا اثر ظالم کے لیے بھی ویسا ہی ہے جیسا عادل کے لیے ہے، بیماری اور صحت کا قانون باطل کے علمبرداروں کے لیے بھی اسی طرح عمل کرتا ہے جس طرح حق کے پرستاروں کے لیے! طبعی قانون کے تحت یہاں ایک قسم کے اسباب سے ایک ہی قسم کا نتیجہ ہمیشہ برآمد ہوتا ہے اور تجربہ سے اسے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اخلاقی قانون چونکہ یہاں کا اصل کارفرما قانون نہیں ہے لہٰذا امورِ دینی و اخلاقی میں ایک سبب سے ایک لازمی نتیجہ کو وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایک شخص بھلی زندگی گذارتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے اچھے نتائج سے دوچار ہو، لیکن دوسری طرف بکثرت ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ فقر و فاقہ، بیماری و حادثات اور مخالفتوں اور مزاحمتوں کا ہدف بنا رہتا ہے۔ دوسری طرف ایک شخص مجرمانہ زندگی بسر کرتا ہے اور کبھی وہ اپنے کسی جرم کا کچھ برا صلہ بھی پا لیتا ہے،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن بے شمار مثالیں ایسی سامنے آتی ہیں کہ وہ پوری زندگی عیش و تنعم میں گذار کر رخصت ہو جاتا ہے اور اس کے اعمال کے نتائج برآمد ہوتے نظر نہیں آتے۔ جس طرح ہم امورِ طبعی میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہائیڈروجن اور آکسیجن کے سالموں کی باہمی ترکیب سے لازماً پانی بن جائے گا اس طرح امورِ دینی و اخلاقی میں یہ حکم نہیں لگایا جاسکتا کہ فلاں خیال اور فلاں عمل کے نتیجے میں لازماً فلاں صورت ظہور پذیر ہوگی۔ اس دنیا میں کسی کو مبتلائے مصیبت پاکر ہم یہ حتمی فیصلہ صادر نہیں کرسکتے کہ یہ شخص کسی اخلاقی جرم کا حساب دے رہا ہے، اور نہ کسی کو نعمت سے سرفراز پاکر یہ قطعی رائے دے سکتے ہیں کہ یہ شخص اپنی کسی نیکی کا پھل کھا رہا ہے۔

پھر یہ واضح ہے کہ اگر اخلاقی اعمال کے نتائج طبعی طور پر اسی دنیا میں پوری طرح برآمد ہو جایا کرتے تو انسانی معاشروں کو قانون و عدل کے مختلف نظام قائم کرنے کی سرے سے ضرورت ہی پیش نہ آتی، قضاء و قصاص کے نظام کا خود شریعتِ الٰہیہ کی طرف سے نافذ کیا جانا اس امر کی دلیل ہے کہ ہماری حیاتِ ارضی میں طبعی طور پر اخلاقی جزاء و سزا کا اہتمام نہیں پایا جاتا اور اسی خلاء کو نظامِ قضاء و قصاص سے ایک حد تک بھرا جاتا ہے۔ لیکن قضاء و قصاص کا نظام بھی انسانی علم و اختیار کی کوتاہی کی وجہ سے چونکہ ناقص رہ جاتا ہے، یعنی نہ تمام افراد کے اعمال کا پورا پورا احتساب ممکن ہے اور نہ ہر نیکی اور بدی کی جزاء و سزا دینا کسی انسانی نظام کے بس میں ہے، لہٰذا مکمل محاسبہ و جزا کو آخرت پر معلق رکھا گیا ہے۔ یوم الدین کی ضرورت ہی یہی ہے کہ حیاتِ ارضی میں چونکہ انسانی اعمال کے محاسبہ و جزا کا کام مکمل نہیں ہوسکتا، لہٰذا اس کی تکمیل کے لیے ایک آخری عدالت ہونی چاہیے جس کے علم سے کسی کا کوئی عمل باہر نہ رہے اور جس کے حدودِ اختیار سے کسی کے اعمال کی جزاء و سزا کا دینا بالاتر نہ ہو۔

پس تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہماری حیاتِ ارضی فی الجملہ اخلاقی قوانین کے تسلط میں نہیں، بلکہ اس پر مکمل کارفرمائی طبعی عوامل کی ہے۔ یہ طبعی عوامل جتنا موقع اخلاقی قوانین کو کام کرنے کا دیتے ہیں، اتنا اثر ان کا نمودار ہو جاتا ہے اور جہاں یہ موقع نہیں دیتے وہاں اخلاقی قوانین کے تقاضے پورے نہیں ہوسکتے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۲) لیکن اس طبعی نظم کو ہم ایک ایسا اندھا مشینی نظم نہیں مانتے جو اللہ تعالیٰ کے تصرف کے بغیر چل رہا ہے اور جس میں اس کا بنانے والا بالکل بالائے طاق ہو کر رہ گیا ہے۔ بڑے اور چھوٹے جتنے بھی واقعات و حوادث اس نظم کے تحت حیاتِ انسانی کو پیش آرہے ہیں ان کے پیچھے گوناگوں مصلحتیں اور حکمتیں کام کرتی ہیں۔ اس حقیقت کا سب سے زیادہ علم ہمیں سورۂ کہف کے تینوں قصوں سے حاصل ہوتا ہے۔ خصوصیت سے وہ مشہور قصہ جس کے کردار کو مفسرین نے خضر علیہ السلام کے نام سے پیش کیا ہے، تمام تر اسی بات کی وضاحت کے لیے نبی صلعم پر وحی کیا گیا ہے کہ واقعات و حوادث کے پیچھے مشیتِ الٰہی کا دستِ تصرف کن حکمتوں اور مقاصد کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ مگر یہی قصہ اس امر پر بھی دلالت کرتا ہے کہ مشیت کے سامنے لگی بندھی کوئی ایک حکمت و مصلحت ہی نہیں، بلکہ ہر واقعہ کے پیچھے ایک علیحدہ مقصدیت پائی جاتی ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ بعض طبعی واقعات کے پیچھے اخلاقی امور سے متعلق کوئی حکمت کام کر رہی ہو، مثلاً کسی بندۂ صالح کو کسی نعمت سے نوازنا یا کسی مصیبت سے بچانا، کسی متذبذب کو ہدایت کی طرف متوجہ کرنا، یا کسی مجرم کو سزا دینا یا دوسروں کے لیے عبرت بنا دینا مطلوب ہو۔ لیکن اور بے شمار حکمتیں ہیں۔ مثلاً بہت سے واقعات محض اس لیے ہوتے ہیں کہ ان کے بل پر مشیت مخلوق کی رزق رسانی کا سرو سامان کرتی ہے۔ بہت سی مصیبتیں افراد کو اس لیے پیش آتی ہیں کہ ان کو عظیم تر مصیبتوں سے بچانا یا کوئی بڑا فائدہ پہنچانا مدنظر ہوتا ہے، اسی طرح بہت سی راحتیں لوگوں کو اس لیے پیش آتی ہیں کہ ان کی اوٹ میں کاروانِ مصیبت مارچ کرتا آرہا ہوتا ہے۔ بہت سے حوادث کا منشا یہ ہوتا ہے کہ بندوں کی نیتوں اور ان کے دعووں کی جانچ کر کے اور ان کو اپنی صلاحیتوں کے ظاہر کرنے کا پورا پورا موقع دے کر ان میں سے کھوٹے اور کھرے مال کو چھانٹ دیا جائے۔ بہت سے انعامات اور بہت سے مصائب اس لیے نازل ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو آئندہ کے کچھ معرکوں کے لیے ان کے ذریعے تربیت دینا ہے۔ اور بہت سے احوال سے افراد کو اس لیے گذرنا پڑتا ہے کہ کائنات یا عالم انسانی کی کسی بڑی اور مجموعی مصلحت کے لیے ایسا ضروری ہوتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس لیے فی الجملہ اس امر پر ایمان رکھتے ہوئے کہ حیاتِ ارضی کے واقعات و حوادث میں اللہ تعالیٰ کی مصلحتیں اور حکمتیں کارفرما ہیں اور کوئی پتہ بھی کسی اہم مقصد کے بغیر حرکت میں نہیں آتا، یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ ہر واقعہ میں اخلاقی جزا و سزا کا قانون اثر انداز ہو رہا ہے۔

(۳) انسان کی حیاتِ اجتماعی ٹھیک وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں سے اخلاقی مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ ایک سے زیادہ افراد جب یکجا رہنے بسنے کا آغاز کرتے ہیں اور ان کے درمیان معاملات واقع ہونا شروع ہوتے ہیں تو انسان فوراً نیکی اور بدی، راستی اور ناراستی، ظلم اور انصاف، دیانت اور خیانت، ایفاءِ عہد اور بدعہدی کے امتیازات کی سرحدوں میں داخل ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ ہیئتِ اجتماعی کی اساس اخلاق پر قائم ہے۔ چنانچہ یہ بالکل امرِ واقعہ ہے کہ قوموں اور معاشروں اور سلطنتوں اور تمدنوں کے وجود پر اخلاقی قانون ٹھیک اسی طرح عمل کرتا ہے جس طرح طبیعی قانون؛ اجتماعی زندگی جب بھی صحیح اخلاقی قدروں پر استوار ہوتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی عنایات سے بہرہ ور ہو کر خود مضبوط اور چھا جانے والی قوت بنتی ہے اور افراد کو حیاتِ مطمئنہ اور حیاتِ طیبہ کی نعمتوں سے مالا مال کرتی ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ صالح معاشروں کو پھلنے پھولنے کا پورا موقع دیا جاتا ہے۔ بخلاف اس کے اجتماعی زندگی اگر اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے منحرف ہو کر اخلاقی قانون سے روگردانی کرتی ہے اور اپنے اندر سے ایک فاسد نظام کو پرورش دیتی ہے تو وہ تمام افراد کو "معیشۃً ضنکا" کی حالت میں مبتلا کر دیتی ہے۔ قرآن تاریخ میں سے ان تمام اقوام کی مثالیں بطور شواہد پیش کر کے جن کا حوالہ آپ نے دیا ہے، اللہ تعالیٰ کے اس قانون کو واضح کرتا ہے کہ ایسی قوموں اور تمدنوں کو پوری طرح متنبہ کیا جاتا ہے اور اگر وہ اپنی اصلاح کرنے پر تیار نہ ہوں تو ان کو ملیامیٹ کر دیا جاتا ہے۔

اجتماعی زندگی کی قوت، اس کی معیشت، اس کا دفاع، اس کا نظامِ عدل، اس کا امن، اس کا رابطۂ اخوت، اس کا جذبۂ حمیت، اور اس کا ولولۂ ترقی سب کچھ ظہور ہوتا ہے اس کے افراد کے افکار و اعمال کا! افراد کے خیالات اور اعمال قطرہ قطرہ کر کے اجتماعی زندگی کے تالاب کو بھرتے ہیں۔ پھر اس تالاب میں جو امرت یا جو زہر جمع ہوتا ہے اسی سے سارا نظامِ تمدن سیراب ہوتا ہے۔ اگر پاکیزہ خیالات اور اعمالِ صالحہ غالب رہتے ہیں تو ایک صالح نظام برپا ہوتا ہے اور اس شجرۂ طیبہ کے پھل میں سے تمام افراد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بلکہ ان کی آئندہ نسلوں کو بھی حصہ ملتا ہے۔ اگر گندے خیالات اور اعمال فاسدہ کا زور ہوتا ہے تو ایک نظام فاسد اُبھرتا ہے اور اس کے کانٹوں سے تمام افراد کی جھولیاں بھرتی ہیں بلکہ ان کی بعد کی نسلوں کو بھی ان کی چبھن میں شریک ہونا پڑتا ہے۔

لیکن اجتماعی زندگی میں جو نتائج اخلاقی قانون کے تحت ابھرتے ہیں، وہ فرد فرد کے اعمال کا حساب الگ الگ نہیں چکاتے، بلکہ وہ ہزارہا افراد کے رات دن کے اچھے اور بُرے اعمال کا ایک مجموعی جواب بن کے سامنے آتے ہیں اور پھر ان نتائج سے اچھا یا بُرا جو حصہ افراد کو ملتا ہے وہ بھی اس امتیاز کے ساتھ نہیں ملتا کہ کون نیک ہے اور کون بد، اور کس کی نیکی یا بدی کی مقدار کیا تھی! اخلاقی مسئلے میں اصل پیچیدگی یہی ہے کہ ذمہ داری اور جوابدہی کا سرچشمہ تو ہے فرد، اور اس کے اعمال کے نتائج برآمد ہوتے ہیں تو اجتماعی زندگی کے احوال و شئون کی معرفت، اور پھر مزید پیچیدگی یہ کہ ان مجموعی نتائج کی بھلائی سب کے بھلے کا ذریعہ بنتی ہے اور ان کی برائی میں سب کا برا ہوتا ہے۔ ہم ایک فرد کے فکر و عمل کا نتیجہ اسی فرد کی زندگی میں تلاش کرنا چاہتے ہیں کہ اس نے فلاں کام کیا تو اسے پلٹ کر کیا ملا، اور یہاں ہم متضاد حالات دیکھ کر سکتے میں پڑ جاتے ہیں کہ شاید اس زندگی میں اخلاق کی سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں۔ اخلاق کی اہمیت ہے، لیکن اخلاق چونکہ اجتماعی معاملہ ہے لہٰذا اس کے اثرات و نتائج بھی اجتماعی زندگی میں تلاش کیے جانے چاہئیں ٹھیک اسی طرح جیسے کسی مشین کے ایک پرزے کی خرابی صرف اسی پرزے کو متاثر نہیں کرتی بلکہ مشین بحیثیت مجموعی اس سے اثر پذیر ہوتی ہے اور اس کے عمل میں فساد آتا ہے تو ہر پرزہ اس فساد میں سے حصہ پاتا ہے، اسی طرح فرد کے اخلاقی صلاح و فساد کے اثرات پلٹ کر اسی فرد ہی پر نمودار نہیں ہو جاتے بلکہ پورے نظام معاشرہ میں اس کا فکر و عمل پے درپے لہریں پیدا کرتا ہے جو ایک نقطے سے شروع ہو کر ساحل تک جا پہنچتی ہیں اور قطرے قطرے میں جنبش آجاتی ہے

کیا ہم یہ نہیں دیکھتے کہ خدا کے انبیاء اور ان کے صحابہ و حواریین اور بے شمار صلحا ایسے تھے جنہوں نے حق کی علمبرداری اور نوعِ انسانی کی سچی خدمت میں اپنی عمریں صرف کر دیں، لیکن اگر ان کے کارناموں کا نتیجہ ہم ان کی اپنی زندگیوں میں تلاش کریں تو فقر و فاقہ، ہجرت، عقوبت، قید، تازیانوں اور شہادت کے سوا ہمیں کچھ نہیں ملتا۔ بخلاف اس کے دورِ قدیم کے فراعنہ و نماردہ، اور عہدِ حاضر کے حکمرانوں، سرمایہ داروں، جاگیرداروں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عیش پرستوں اور جبّاد مجرموں کو آپ دیکھیں گے کہ وہ پوری بے باکی سے خدا کے بندوں پر ظلم توڑتے ہیں انسانیت کی راہ میں مصائب کے کانٹے بوتے ہیں، ایک ایک اخلاقی قدر کی جڑیں کھودتے ہیں، لیکن جب ہم ان کے اعمال کے نتائج خود ان کی زندگیوں میں دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں وہاں دولت کی ریل پیل ملتی ہے، خدم و حشم کے ہجوم نظر آتے ہیں، اور تنعم و لذائذ کی کثرت دکھائی دیتی ہے۔ اول الذکر گروہ صلحا نیکی کے جو بیج تاریخ میں بوتا رہتا ہے وہ ایک وقت سے کر پروان چڑھتے اور پھر دنیا کی دنیا ان کے پھل کھاتی ہے، اسی طرح مؤخر الذکر گروہ فساق بدی کی جو تخم بندی کرتا رہتا ہے اس سے بھی کچھ عرصے میں جا کر برگ و بار ظہور پذیر ہوتے ہیں اور اس وقت کروڑوں بندگانِ خدا کو اجتماعی زندگی کے واسطے سے ان کی تلخیوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ بھلائی اور برائی کے کتنے ہی خزانے ہیں جو نظامِ تمدن کے واسطے سے ایک نسل کو اپنی سابق نسل کی طرف سے ورثہ میں ملتے ہیں، اور اسی طرح نعمتوں اور مصیبتوں کے کتنے ہی چمن اور خارزار ہوتے ہیں جنہیں موجودہ نسل آئندہ نسل کے سر تھوپ کر رخصت ہوتی ہے۔ یہ جنگیں اور انقلاب، یہ معاشی ناہمواریاں، یہ فسق و فجور، یہ افلاس اور ضعف، یہ غلامی اور باہم آویزی جن سے اقوامِ عالم دوچار ہوتی رہتی ہیں، کون اس امر کو مشخص کر سکتا ہے کہ ان میں بے شمار افرادِ انسانی کو مبتلا کر دینے کی ذمّہ داری کس کے حصّے میں کتنی آتی ہے۔

اور کیسے یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ان کا وبال صرف ان کے ذمّہ دار افراد تک محدود رہتا ہے اسی طرح راستی اور امن و انصاف کا کوئی نظامِ سعادت کسی گروہ کے حصّے میں آیا ہو تو یہ تحقیق کہاں ممکن ہے کہ اس کی تعمیر میں کس نے کتنا حصّہ ادا کیا اور کیسے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نظامِ سعادت کی برکات اس کے معماروں ہی کی جھولی میں پڑیں گی۔

ایک نظامِ باطل کے اندر سے جو لوگ اٹھ کر ایک نظامِ سعادت کی دعوت دیتے ہیں ان کو عمریں مصیبت اور کشمکش میں گذارنی پڑتی ہیں اور اس کی تعمیر کے لیے اپنی ہڈیاں اور اپنا گوشت اور اپنا خون مسالے کے طور پر پیش کرنا پڑتا ہے۔ بظاہر ان کو اس کا کوئی صلہ نہیں ملتا۔ اس کام کی بنیاد ایک جذبۂ ایثار پر ہوتی ہے اور اس میں صرف رضائے الٰہی کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے۔ اسی لیے اس کام کے کرنے والوں کو صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ:۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۔

اور ہم تم کو خوف اور بھوک اور مالوں اور جانوں اور فصلوں کے کچھ نقصانات سے دوچار کرکے آزمائش میں ڈالیں گے۔ (اے نبیؐ!) بشارت دیجیے صبر کیشوں کو، کہ جو (راہ حق میں) کسی مصیبت کے پیش آجانے پر پکار اٹھتے ہیں کہ ہم اللہ کے (ہیں بے وقف) ہیں اور ہمیں لوٹ کر اسی کے حضور جانا ہے۔

یہی انتباہ دوسرے مقام پر یوں بھی دیا گیا ہے کہ "کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ (بس یونہی) جنت میں جا پہنچو گے، حالانکہ ابھی تک (راہ حق میں) اللہ نے تم کو اس طرح (آزمائش میں) لیا ہی نہیں، جس طرح تم سے پہلے گذر جانے والوں کو لیا تھا۔ ان کو سختی اور مصیبت پیش آئی اور وہ خوب جھنجوڑے گئے، یہاں تک کہ رسول اور اس کے ساتھ ایمان لانے والے چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟" اسی بات کو آنحضور صلعم نے یوں بیان کیا ہے کہ جنت تکالیف سے گھری ہوئی ہے (او کما قال)

اب آپ خود سوچیے کہ جب اللہ اور اس کا رسولؐ خود صراحت سے فرما رہے ہیں کہ راہ حق پر چلنے والوں کو طرح طرح کے مصائب کی آزمائشوں سے گذرنا پڑتا ہے، اور پھر یہ بھی ضروری نہیں ہوتا کہ ان کی جدوجہد ان کے روبرو نتائج برآمد کردے (اما نرینک بعض الذی نعدك او نتوفینك) تو ایسی حالت میں کسی مخلص مومن کو آپ فقروفاقہ، یا خانہ بدوشی، یا قید و بند یا قتل کے مراحل آزمائش میں سے گزرتے ہوئے کس طرح یہ رائے قائم کرسکیں گے کہ یہ شخص ضرور عنداللہ مجرم ہے اور اپنے کیے کی سزا پا رہا ہے۔ اسی طرح مخالفین حق کو برسر اقتدار یا نعمتوں سے شادکام پاکر آپ کس طرح یہ دعویٰ کرسکیں گے کہ یہ لوگ ضرور ایمان و اخلاق میں پیش پیش ہیں اور اپنی نیکی کا پھل کھا رہے ہیں۔

پس اگرچہ قوموں اور تمدنوں کا معاملہ اخلاقی قانون کے عمل کے تابع ہے، لیکن افراد کے اعمال کا حساب حیاتِ ارضی میں نہیں چکتا بلکہ وہ اجتماعی بناؤ اور بگاڑ میں جو حصہ ادا کر جاتے ہیں اس کا جائزہ لینے اور اس کا بدلہ دینے کے لیے آخرت کی عدالت ناگزیر ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۴) ایک معاشرہ میں اگر کسی برائی کا ارتکاب کیا جائے اور وہ اس کی روک تھام نہ کرے بلکہ اس کے منفی تعاون کی وجہ سے وہ برائی جڑ پکڑے، پھلے پھولے اور اپنے مفاسد سے سارے ماحول کو متاثر کر دے تو اللہ کا قانون یہی ہے کہ وہ سارا معاشرہ اس برائی میں حصہ دار قرار پاتا ہے اور اس کا خمیازہ بھگتتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ قانون بھی اجتماعی زندگی سے متعلق ہے، نہ کہ افراد سے!

(۵) حدیث میں یہ بات مختلف طریقوں سے بیان کی گئی ہے کہ ایک مومن صالح جس کی مجموعی زندگی اللہ کی وفاداری پر استوار ہو، جو دانستہ حق سے انحراف کرنے والا اور کسی برائی پر اصرار کرنے والا نہ ہو، اور جو اپنی غلطیوں کا احساس کرتے ہی نادم ہونے اور توبہ کرنے پر مائل ہوتا ہو، اس سے بہ تقاضائے بشریت جو گناہ سرزد ہو جائیں ان میں سے جن کا انکشاف دنیا میں ہو گیا اور قضا و قصاص کی صورت میں معاملہ چک گیا تو چک گیا، لیکن بقیہ لغزشیں جن پر اللہ تعالیٰ نے پردہ ڈال دیا، ان کا کفارہ وہ تکالیف اور مصیبتیں ہو جائیں گی جو ارضی زندگی میں طبعی طور پر پیش آئی ہیں، بشرطیکہ ایک بندہ ان کا سامنا اللہ کی رضا کے مطابق صبر کے ساتھ کرے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک فضل خاص ہے جو وہ اپنے بندوں کی وفاداری کے صلے میں فرماتا ہے کہ ان کی لغزشوں کی سزا وہ طبعی تکالیف سے مجرا کر دیتا ہے۔ اس سے یہ بات نہیں نکلتی کہ طبعی تکالیف اور مصائب اخلاقی اعمال کے نتائج ہیں۔

ختمِ نبوت کے خلاف قادیانیوں کے دلائل

سوال۔ قادیانی حضرات قرآن کی بعض آیات اور بعض احادیث سے بھی ختمِ نبوت کے خلاف دلائل فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً وہ سورۂ اعراف کی آیت یَا بَنِیٓ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ . . . کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ قرآن کے نزول اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اس آیت کا خطاب امتِ محمدیہ سے ہی ہو سکتا ہے۔ یہاں بنی آدم سے مراد یہی امت ہے اور اسی امت کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ اگر "کبھی تمہارے پاس تم میں سے رسول آئیں . . ." اس سے

© rasailojaraid.com